پروفیسر سید عابد علی

ابوسعید ابوالخیر

(ولادت ۳۵۷ ہجری — وفات ۴۴۰ ہجری)

کلمہ تصوف کے اشتقاق کے متعلق، مختلف نظریے ہیں۔ اور کم و بیش ہر نظریے کو کسی جلیل القدر دانش ور کی تائید حاصل ہے۔ لیکن پلڑا اسی طرف جھکا ہوا نظر آتا ہے کہ اس کلمے کا مادہ صوف ہے۔ اور اسی اعتبار سے صوفی پشمینہ پوش کہلاتے ہیں۔ جو عالم، یونانی کلمہ سوفی (SOPHY - دانش) کو اس کا مادہ بتاتے ہیں ان پر یہ اعتراض برابر ہوتا رہا ہے کہ عربی میں یہی کلمہ سفسط میں موجود ہے اور بصورت سین مہملہ ہے۔ تو صوفی میں 'ص' کی شکل کیوں اختیار کی۔ خود اس مسلک کے آغاز و ارتقا اور اس کے ماخذ کے متعلق، مختلف اور متناقص نظریے ہیں۔ جن میں پلڑا پھر اسی طرف جھکا ہوا دکھائی دیتا ہے کہ کم از کم عجمی تصوف میں تو بہت سے افکار و تصورات کی آمیزش ہوئی ہے۔ ان اختلافی مسائل سے قطع نظر عجمی تصوف ایک منزل تک تو برابر سرچشمۂ ہدایت رہا۔ اور اس کے پیرو، بہ قولِ علامہ اقبال مرحوم، اپنے تہہ قلب میں شریعت کے احکام کی حقانیت محسوس کرتے رہے کہ یہی اصلی تصوف ہے۔ اس منزل تک، شریعت اور طریقت، گویا ایک دوسرے میں سموئے ہے اور یہ دور حقیقت میں تصوف کا ابتدائی دور ہے جب شرعی احکام کی متابعت، تصوف کے مسلک کے عین مطابق تھی۔ اور یہ مقام نہ آیا تھا کہ طریقت کا راستہ، شریعت کی شاہراہ سے ہٹ کر، وحدتِ وجود اور اسی قسم کے دوسرے مسائل کے حیرت زار میں گم ہو کر رہ جائے۔ بلکہ احکام شرعی کا سقوط بھی طریقت کے مسلک کے منافی نہ رہے۔ یہ دوئی کا مقام، جب شریعت اور طریقت کے راستے بالکل جدا ہو گئے عالم اسلام کے لئے بہت مہلک ثابت ہوا۔ کہ اسلامی تصورات و افکار کی شکل بدل دی گئی، اور پیغمبر اسلام کی تعلیمات میں آہستہ آہستہ وہ عجمی اثرات سرایت کر گئے جن کو شریعت حقہ سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اسی آمیزش کے متعلق علامہ اقبال مرحوم نے کہا تھا:

تمدن، تصوف، شریعت کلام — بتانِ عجم کے پجاری تمام
حقیقت خرافات میں کھو گئی — یہ اُمت روایات میں کھو گئی
وہ صوفی کہ تھا خدمتِ حق میں مرد — محبت میں یکتا حمیت میں فرد
عجم کے خیالات میں کھو گیا — یہ سالک مقامات میں کھو گیا

زبورِ عجم میں، اس دوئی کی ہلاکت آفرینیوں کی طرف علامہ نے زیادہ تیز نظروں سے دیکھا اور گلشنِ راز جدید میں آریائی ذہن کی اس خصوصیت کی طرف بھی اشارہ کیا کہ حقیقت کو، مجزا کر کے پہچانتی ہے اور اس سے زیادہ معنی خیز بات یہ ہے کہ

منصور حلاج کو اور شنکر اچاریہ (ویدانت کا مفسر) کو اس طرح ایک شعر میں جمع کیا۔ گویا ان کے افکار و عقائد میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ اور فرمایا:

دگر از شنکر و منصور کم گوئی خدارا ہم براہِ خویشتن جوئی

ابو سعید ابوالخیر جن کا نام، طرازِ عنوان ہے۔ ان ابتدائی صوفیوں اور مفکروں میں سے ہیں۔ جن کے ذہن میں تصوف اور طریقت، شریعتِ حقہ ہی کے احکام کی صداقت کو اپنے وجود باطنی میں محسوس کرنے کا نام تھا۔ جن کے ملفوظات سے بے شمار نفوس فیض یاب ہوئے۔ اور جن کے اشعار سے آج تک ارباب ذوق، متاثر ہوتے ہیں۔

رضا قلی خاں ہدایت، صاحب مجمع الفصحا، بیان کرتے ہیں کہ ان کا وطن مھنہ ہے۔ اور اس پر تمام مورخ اور تذکرہ نویس متفق ہیں۔ ہاں اختلاف اس بارے میں ہے کہ یہ مھنہ کہاں واقع ہے۔ رضا قلی کا بیان ہے کہ یہ پشاور کے قریب ہے۔ لیکن ملک الشعرا بہار کی تحقیق یہ ہے کہ یہ مھنہ، ابیورد کے اعمال میں شامل تھا اور آج کل دولت اشتراکیہ روس کی مقبوضات کا جزو ہے)۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ یہ شہر سرخس اور ابیورد کے درمیان واقع تھا۔

لی اسٹرینج، جغرافیہ خلافت مشرقی میں، (مترجمہ جمیل الرحمٰن) لکھتے ہیں کہ خراسان میں نسا کے مشرق میں پہاڑی سلسلوں سے ہٹا ہوا، دشت مرد کے کنارے، ابیورد واقع ہے۔ یہ کبھی بہت بارونق شہر تھا اور تجارتی منڈی ہونے کے اعتبار سے بہت مشہور تھا۔ جس علاقے میں ابیورد واقع تھا اسے فادران کہتے تھے۔ (ابو سعید فادران کا ذکر بار بار کرتا ہے) اس علاقے کا صدر مقام مھنہ تھا۔ اب رہا سرخس کا شہر تو وہ شہر طوس سے مرو کا رن جانے والی سڑک پر دریائے مشہد کے دائیں، یا مشرقی کنارے ہے۔ قزوینی کا بیان ہے کہ اس شہر میں عماموں اور نقابوں کے لئے بہت خوبصورت اور نفیس کپڑے بنے جاتے تھے۔ اور ان پر سنہری کلابتوں کا کام بھی بہت اچھا ہوتا تھا۔

معلوم ہوتا ہے کہ پہلے تو شیخ نے اپنے شہر ہی میں تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا لیکن کچھ مدت کے بعد، مرو چلے گئے، کہ ان دنوں مرجع فضل و کمال تھا۔ مرو بہت مشہور شہر ہے۔ خلفائے عباسی میں سے جب مامون الرشید نے یہاں اپنا محل تعمیر کرایا تو اس کی رونق کو چار چاند لگ گئے۔ (روایتِ مشہور کے مطابق پہلا فارسی قصیدہ، ابوالعباس، ساکن مرو نے مامون کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ لیکن علامہ محمد بن عبدالوہاب قزوینی نے بست مقالہ میں اس داستان کو جھٹلایا ہے)۔ خلفائے عباسی کے سریر آرائے خلافت ہونے سے پہلے بھی یہ شہر بارونق اور خوش سواد تھا۔ ساسانی خاندان کے آخری بادشاہ یزدجرد ثالث نے اسی شہر کی ایک پن چکی کی عمارت میں پناہ لی تھی اور پن چکی کے مالک نے جواہرات کے لالچ سے اسے ہلاک کر دیا تھا۔ عربوں کی تسخیرِ ایران کے بعد مرو کا شہر زیادہ بارونق ہوتا چلا گیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب یہ شہر اپنے عروج پر تھا تو ممالک اسلامی میں اس کے کتب خانے بے نظیر شمار کئے جاتے تھے۔

ابو سعید ابوالخیر نے مرو میں ابو عبداللہ المصری سے استفادہ کیا، کہ فقہ میں بھی دسترس رکھتے تھے اور طریقت و تصوف کے

رموز سے بھی آگاہ تھے۔ پھر ابو عبدالرحمٰن اسلمی (متوفی ۴۱۲ھ) کے ہاتھ پر بیعت کی۔ تصوف کے دائرے میں داخل ہو جانے کے بعد شیخ ابو سعید نے اپنی زندگی نہایت اطمینان اور سکونِ قلب سے بسر کی اور قولاً و فعلاً اپنے عقیدتمندان کیلئے شمع ہدایت بنے رہے۔

شیخ ابو سعید کے سوانح اور ان کے ملفوظات اس نفیس تصنیف میں محفوظ کر دیئے گئے ہیں جو ان کے پوتے محمد بن المنور سے منسوب ہے۔ اس کتاب کا سالِ تالیف متعین نہیں ہو سکا لیکن یہ طے ہے کہ فتنہ غز کے بعد لکھی گئی ہے۔ (گویا ۵۴۸ ہجری کے بعد) اور یہ بھی طے ہے کہ ایک غوری بادشاہ کے نام معنون کی گئی ہے۔ اس بادشاہ کا نام ابو الفتح محمد بن سام بتایا جاتا ہے اور تاریخ وفات ۶۰۲۔ لیکن یہاں کچھ اشتباہ ضرور ہوا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ابو الفتح غیاث الدین غوری کا لقب ہے اور اس نے بہ اتفاق آرا ۵۹۹ ہجری میں وفات پائی ہے اور جس غوری بادشاہ نے ۶۰۲ ہجری میں وفات پائی ہے وہ معز الدین محمد بن سام ہے کہ ابو الفتح نہیں کہلاتا۔ بلکہ اس نے شہاب الدین غوری کے لقب سے شہرت پائی ہے (اس کی تاریخ وفات البتہ ۶۰۲ ہجری ہے)۔

محمد بن المنور کی اس تالیف کا نام، اسرار التوحید فی مقامات شیخ ابی سعید ہے۔ اور اگرچہ چھٹی صدی میں لکھی جاتی ہے۔ لیکن اس کا انداز نگارش بالکل سامانیوں کے زمانے کی نثر کا سا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مولف نے کوشش کی ہے کہ انداز و اسلوب کو نہ صرف سہل ممتنع کی حد تک پہنچا دے بلکہ شیخ ابو سعید کے جو کلمات و اقوال نقل کئے ہیں وہ گویا عیناً ان کی گفتگو ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ سلاست روانی، سادگی، اختصار اور متانت و استحکام اسلوب کے اعتبار سے یہ کتاب اپنے زمانے کی کتابوں میں بے نظیر ہے۔

اس خریطۂ جواہر میں جو گوہر تابناک ہیں ان میں سے بطور نمونہ ایک کی صورت ملاحظہ فرمائیے۔ محمد بن المنور لکھتے ہیں کہ ایک روز شیخ، اپنے رفیقوں کے ساتھ، گورستانِ حیرہ تشریف لے گئے۔ جہاں بہت سے مشائخ اور بزرگ دفن ہیں۔ وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ کچھ لوگ سرمستی کے عالم میں دف بجا رہے تھے اور شراب پی رہے تھے۔ ابو سعید کے ساتھیوں نے چاہا کہ ان کو سختی سے ٹوکیں۔ لیکن شیخ نے روکا، ساتھیوں کو پیچھے رہنے کا اشارہ کیا۔ خود آگے بڑھے اور دف بجانے والوں سے مخاطب ہو کر کہا۔ خدا کرے کہ جس طرح آپ اس دنیا میں خوش دل ہیں۔ دوسری دنیا میں بھی اسی طرح خوش دل اور شاد کام و بامراد رہیں۔ یہ سن کر دف بجانے والوں کے ہاتھ رک گئے اور شراب پینے والوں کا نشہ گویا کافور ہو گیا۔ سوچنے لگے اور آخر شیخ کے قدموں پر گر کر معافی کے خواستگار ہوئے۔ شیخ نے معاصی سے توبہ کرنے کی تلقین کی اور ایسا وقت تھا کہ موثر ہوئی۔

ملفوظات سے زیادہ شیخ اپنی رباعیات کی وجہ سے مشہور ہیں۔ ایتھے سے لے کر رضا زادہ شفق تک کوئی دانش ور اور نقاد نہیں جو ان کے کمالِ فن، ان کے خلوص اور ان کی رباعیات کی اخلاقی قدر و قیمت کا معترف نہ ہو۔ رضا زادہ شفق، تصوف کی دو راہیں بتاتے ہیں۔ ایک منفی (اس پر ویدانت کا اثر نمایاں ہے) اس راہ میں ترکِ دنیا، ریاضت، قناعت، ترجیح فقر، پشمینہ پوشی، اور انقطاع علایق پر زور دیا جاتا ہے۔ دوسری راہ مثبت ہے۔ اس میں سلوک، جستجو، طلب، مراحل اخلاص، عبادت و ایثار، خدمتِ خلق (کسی فائدے کی توقع کے بغیر) تربیتِ نفس اور محبت و کسب فضیلتِ معرفت پر زور دیا جاتا ہے۔ دوسری راہ میں اگر تمام

احکام شرعی کی پیروی بھی لازم قرار دی جائے تو اصل تصوف بن جاتی ہے۔ شیخ کی راہ معلوم ہوتا ہے کہ یہی تھی کہ شرعی احکام کی پابندی کے ساتھ، سلوک و جذب کی منزلیں طے ہوں۔ جو کچھ انھوں نے منہ سے کہا ہے وہ تو کم و بیش اسرار التوحید میں مندرج ہے لیکن جو کچھ انھوں نے سوچا ہے وہ بھی، نہایت نفیس رباعیات کی شکل میں موجود ہے۔

رباعی، جسے دوبیتی اور چاربیتی بھی کہتے ہیں۔ فارسی شعر کی بہت پرانی صنف ہے۔ چنانچہ عنصری ایک رباعی گو بوطلب کا نام لیتا ہے اور اس کے ساتھ شہید کی غزل گوئی کا ذکر کرتا ہے۔ اس سے گمان ہوتا ہے کہ دونوں معاصر تھے۔ یا دونوں کے زمانے میں بہت زیادہ فرق نہ تھا۔ شہید رودکی کا معاصر تھا۔ اور اس نے شہید کا مرثیہ بھی لکھا ہے۔ تو رباعی اس وقت سے برابر مقبول و مرغوب رہی ہے۔ رباعی ہی کو ترانہ اور قول بھی کہتے ہیں۔ قول سے قوال ہے جو آجکل سماع کی محفلوں کو گرماتا ہے۔ اور اہل دل کو وجد میں لاتا ہے۔ ترانہ اور قول، دونوں ناموں سے معلوم ہوتا ہے کہ رباعی اصلاً، گانے کی چیز تھی اور صاحب قابوس نامہ نے جو اشارات جستہ جستہ کئے ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے، کہ گانے والے اپنی مقبول ترین دھنیں، رباعی کی شکل ہی میں گاتے تھے۔ تو شروع ہی سے رباعی کے مضامین بھی ایسے ہی تھے۔ جو گانے کے لئے موزوں اور مناسب ہوں اور عام لوگوں کو پسند آئیں۔ عشق و محبت کی واردات، اور ہوس کاری کے افسانے، رباعی میں خوب مزے لے لے کر بیان کئے جاتے تھے اور گانے والے ان چیزوں کو ترانہ، اور قول، کی صورت میں گاتے تھے۔

شیخ ابوسعید پہلے شاعر ہیں جنھوں نے گویا رباعی کی تطہیر کی اور (حسن و عشق کی واردات کے علاوہ) جذب و سلوک، معرفت، تربیت ذہنی، اور اخلاص و محبت الٰہی کے مضامین، رباعی میں اس طرح سموئے کہ اب معلوم ہوتا ہے گویا رباعی، خاص اسی قسم کے مضمونوں کے لئے وضع کی گئی تھی۔ یہ بہت بڑا کارنامہ ہے اور بڑے حوصلے کی بات ہے کہ ایسی صنف سخن جو غالباً بدون استثنا نشاط و طرب کی محفلوں کے لئے مخصوص تھی، مضامین کے اعتبار سے ایسی بلند پایہ کر دی گئی کہ اس کے بعد فلسفیوں نے بھی دقیق سے دقیق خیالات رباعی کے دو شعروں میں ادا کر دیئے۔ اور صوفی شعرا نے تو سلجوقی عہد میں بیشتر رباعی ہی کو منصوفانہ افکار و تصورات کی اشاعت کا ذریعہ بنایا۔ یوں کہنا چاہیئے کہ شیخ نے رباعی کی تجلیل کی ہے۔ اسے فرش خاک سے اٹھا کر، ثریا تک پہنچا دیا ہے! جو صنف سخن، بادہ کشی کی محفلوں میں یا عیش و طرب کے جلسوں میں، گانے والوں کے لئے مخصوص تھی نہ اکابر صوفیہ کے افکار و تصورات کے اظہار کا وسیلہ بن گئی۔

ان رباعیات کے مضامین عالی، اسلوب نگارش، خلوص اور احساس کی شدت پر غور فرمایئے گا۔ اور اس بات کو بھی ملحوظ رکھیئے گا کہ رباعی جو "ملعونات" میں شامل تھی یعنی گانے بجانے کے لئے، کس طرح بندے اور معبود کے باہمی رابطے اور منازل و مراحل طلب کے اظہار کا وسیلہ بن گئی ہے!

گفتار مکو دارم و کردارم نیست — از گفت نکوئے و بے عمل عارم نیست
دشوار بود گفتن و کردن آساں — آساں بسیار پیچ دشوارم نیست

روزم بہ غم جہان فرسودہ گزشت — شب در ہوس بودہ و نابودہ گزشت
عمرے کہ از دمے جہانے ارزد — القصہ بہ فکرہائے بیہودہ گزشت

راہ تو بہر روش کہ پویند خوش است — کوئے تو بہر جہت کہ جویند خوش است
روئے تو بہر دیدہ کہ بینند نکوست — ذکر تو بہر صفت کہ جویند خوش است

گر با غم عشق ساز گار آید دل — بر مرکب آرزو سوار آید دل
گر دل نبود کجا وطن سازد عشق — ور عشق نباشد بچہ کار آید دل

تمام نقاد، مورخ، تذکرہ نویس اور خود صوفیہ متفق الکلمہ ہو کر کہتے ہیں کہ تصوف کے افکار و تصورات کو پہلی بار ایک منظم صورت ابوسعید ہی نے بخشی ہے (قالبِ شعر میں) صرف یہی نہیں بلکہ انھوں نے یہ بھی کیا ہے کہ تغزل کی زبان، اس کی اصطلاحات، اس کی علامات، تشبیہات و استعارات، اس کے کنایے، اور اس کے پہلو دار الفاظ تمام، تصوف کے مطالب بیان کرنے کے لئے استعمال کئے ہیں۔ اور یوں جو الفاظ کبھی محض ہوس کاری یا زیادہ سے زیادہ الفت کا اظہار کرتے تھے، اب انہیں کے ذریعے بندہ عبودیت اور اپنے خلوص اور ذوقِ طلب اور شوقِ دیدار کا اظہار کرتا ہے۔ یہ بھی بہت معرکے کا کام ہے کہ معمولی ضمیریں، معمولی الفاظ ایسے پہلو دار، معنی خیز اور بلند اخلاقی اقدار کے حامل ہو گئے ہیں کہ باید و شاید۔ جس طرح الفاظ میں تنزل ہوتا ہے کہ قوم کی پستی اور زبوں فطرتی کی دلیل ہوتا ہے۔ اسی طرح الفاظ کے معانی میں ترفع ہوتا ہے اور وہ قوم کی بلند اخلاقی کا آئینہ دار ہوتا ہے۔

ابوسعید ابوالخیر کے ہاں الفاظ و تراکیب، اپنے اپنے ادنیٰ معانی ترک کر کے، عالی منزلت معانی کا سراغ دینے لگتے ہیں۔ غزل کی زبان میں یہ مراحلِ ذوق، منازلِ شوق کا بیان دیکھئے گا:

آساں آساں ز خود اماں نتواں یافت — دیں شربت شوق رایگاں نتواں یافت
زاں مے کہ عزیز جانِ مشتاقاں است — یک جرعہ بہ صد ہزار جاں نتواں یافت

سرتا سر دشتِ خاوراں سنگے نیست — کز خونِ دل دیدہ بر آں رنگے نیست
در ہیچ زمین و ہیچ فرسنگے نیست — کز دست غمت نشستہ دل تنگے نیست

شب خیز کہ عاشقاں بہ شب راز کنند — گردِ در و بام دوست پرواز کنند
ہر جا کہ درے بود بہ شب بر بندند — الا در دوست را کہ شب باز کنند

نے باغ نہ بستان و چمن مے خواہم — نے سرو نہ گل نہ یاسمن مے خواہم
خواہم ز خدائے خویش کنجے کہ در آں — من باشم و آں کسے کہ من مے خواہم

ہر چند کہ دل بہ وصل شاداں کردیم — دیدیم کہ خاطرت پریشاں کردیم
خوش باش کہ ما خوے بہ ہجراں کردیم — بر خود دشوار و بر تو آساں کردیم